بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتخار عارف

خواتین وحضرات!

یادش بخیر اسی ہال میں اسی جگہ ستر کی دہائی کے اواخر اور اَسّی کی دہائی میں فیض کے ساتھ تقریباً ہر سال اُن کی وفات تک دو تین تقریبات کا انعقاد ضرور ہوتا رہا ہے۔ گزرے ہوئے اچھے اور خوشگوار دن اور نا قابلِ فراموش یادیں جذباتی کیے دیتی ہیں۔ اُداس بھی ہیں مگر افسردگی میں ایک احساسِ طمانیت بھی ہے کہ ہم نے فیض جیسے عظیم المرتبت شاعر کے ساتھ بے شمار لازوال اور زندہ لمحے گزارے۔ لگتا ہے ابھی فیض سامنے کے دروازے سے اچانک برآمد ہوں گے اور سارا ہال تالیوں کے شور سے گونجنے لگے گا۔ خوشی اور انبساط اور فخر سے کھلے ہوئے چہرے، مسکراتے ہوئے فیض کا استقبال کریں گے اور وہ آ کر سٹیج پر جلوہ افروز ہوں گے۔ گفتگو کریں گے اور ہر شخص محسوس کرے گا کہ جیسے فیض آج اُسی کی دلدہی و دلداری کے لئے بطورِ خاص تشریف لائے ہیں۔ اب فیض ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی شاعری اور ان کا آدرش اور ان کی زندگی آج بھی ویسی ہی زندہ، اُجلی، روشن، موثر اور بامعنی ہے جیسی ان کی زندگی میں تھی۔ آج کا عہد بھی فیض کا عہد ہے، نہ صرف پاکستان کے بسنے والوں کے لئے بلکہ ساری دنیا کے انسانیت دوستوں کے لئے فیض کی معنویت اور بھی ہزار پہلو ہوگئی ہے۔ فیض کا جہانِ حرف ومعنی آج بھی ویسا ہی اُجلا اور روشن وموثر، شاداب سرخرو ہے جیسا ان کی زندگی میں تھا۔

دنیا کی عظیم شاعروں کی کوئی سی فہرست بنالیں آپ دیکھیں گے کہ ان کے موضوعاتِ سخن میں حسن اور محبت اور عشق سرِ فہرست ہیں۔ ستیَم، شِوم، سُندرَم، "اللہ جمیل و یحب الجمال"۔ فیض بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔ نقشِ فریادی ہی میں اُنہوں نے اپنے موضوعِ سخن کی وضاحت کردی تھی۔

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سُلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

اُن کا آنچل ہے، کہ رُخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں ، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دُھندلی سی حِنا کی تحریر
اپنے افکار کی ، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے ؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اَجداد پہ کیا گزری ہے ؟
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے ؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا !
کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے
یہ ہر اِک سَمت پُراَسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

اور یہی محبت فیض کی شاعری کا اسمِ اعظم ٹھہرتا ہے۔ محبوب سے تعلق اپنے آدرش سے محبت، اپنی دھرتی سے محبت، خلقِ خدا سے محبت، امن وسلامتی اور عالمِ انسانیت سے محبت، نہ جانے کیوں مرا دل چاہتا ہے کہ لندن کے اس ہال میں فیض کی ایک نظم ضرور سناؤں۔ فیض نے یہ نظم لندن ہی میں لکھی تھی اور یہاں پڑھی بھی تھی۔

کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہوتو ہو جانے دو
عمر رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہوتو ہو جانے دو
جیسے بیگانہ سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو
گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساس زیاں اور زیادہ ہوگا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
اَن کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا
گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لئے

تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو اور جو نہ چاہو نہ کہو

☆

میں لندن آنے سے پہلے اسلام آباد سے تقریب کے سلسلے میں کراچی گیا تھا۔ کراچی میں پچھلے چند دنوں میں ..... شہری موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ یہ سارے مارے جانے والے لیاری سے بھی تھے، کٹی پہاڑی سے بھی، لانڈھی اور کورنگی سے بھی تھے اور ناظم آباد سے بھی۔ سارے مارے جانے والے بدنصیب لوگوں میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ اکثر و بیشتر پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ سارے ٹیلی وژن چینلز آزادانہ ان واقعات کی فوٹیج دکھا رہے تھے۔ بین کرتی ہوئی مائیں، بیوائیں، بہنیں، بیٹیاں دھاڑیں مار کر روتے ہوئے بوڑھے باپ اور بھائی، بلکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے یتیم معصوم بچے بچیاں —— اور چاروں طرف تماشائی۔ آپ چاہیں تو ان کو تماش بین بھی کہہ سکتے ہیں۔ پارٹیاں ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرتی رہیں اور سیاست دان لاشوں پر سیاست کرتے رہے۔ حکومتیں اور ارباب اختیار قاتلوں کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کا رٹا ہوا سبق سناتے نہیں تھکتے۔ اخباروں کی چیختی ہوئی سرخیاں قتل عام کے احوال بتا رہی تھیں اور چینلز واقعات کے پیچھے کمنٹری میں فیض کی وہ نظم پڑھ رہے تھے جو انھوں نے کراچی ہی کے ایک واقعے کے پس منظر میں لکھی تھی۔

فیلڈ مارشل ایوب خان مادرِ ملت فاطمہ جناح کو انتخابات میں شکست دے چکے تھے مگر مشرقی پاکستان اور کراچی نے مادرِ ملت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ ظاہر ہے اسٹیبلشمنٹ کی نظر میں یہ جرم ناقابل معافی تھا سو فتح کا جشن منایا گیا۔ بقول ہم جیتے جی مصروف رہے کے مطابق تین ہٹی سے لالوکھیت اور ناظم آباد کی طرف ایک کھلے ٹرک پر ساٹھ ستر ہیجڑے لالٹین لیے سوار تھے۔ لالٹین محترمہ فاطمہ جناح کا انتخابی نشان تھا۔ ہیجڑوں کے بالوں کو سفید رنگ دے دیے گئے تھے تاکہ مادرِ ملت سے مشابہت پیدا کی جا سکے۔ جلوس فائرنگ کرتا ہوا لالوکھیت میں داخل ہوا تو محترمہ کے حامیوں نے ایوب خان کے خلاف نعرے لگائے۔ ہراول دستے میں جیپ پر سوار کارکنوں نے جن کی قیادت ایوب خان کے صاحبزادے کر رہے تھے گولی چلا دی، ہلاکت ہوئی اور حالات بگڑ گئے۔ رات بھر مظاہرین اور نوجوان کے ورثا جنازہ لیے مختلف تھانوں کے چکر لگاتے رہے مگر کہیں ایف آئی آر درج نہ ہو سکی اور پھر مظلوم کی لاش بغیر کسی لکھا پڑھی کے دفنا دی گئی تب فیض نے لکھا:

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

نہ دست وناخن قاتل نہ آستیں پہ نشاں

نہ سرخی لب خنجر نہ رنگ نوک سناں

نہ خاک پر کوئی دھبّا نہ بام پر کوئی داغ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

نہ صرف خدمت شاہاں نہ خوں بہا دیتے

نہ دیں کی نذر کہ بیعانہ جزا دیتے

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا

کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

پکارتا رہا ہے آسرا، یتیم لہو

کسی کو بہرسماعت نہ وقت تھا نہ دماغ

نہ مدعی نہ عدالت حساب پاک ہوا

یہ رزق خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

جنرل ایوب کے عہد میں لکھی ہوئی یہ نظم کیا آج کے تناظر میں کچھ زیادہ موثر اور بامعنی نہیں ہوگئی ہے۔

فیض کے تمام ناقدین نے ان کی شاعری میں رجائیت، آس اور اُمید کے عناصر پر بہت وضاحت سے لکھا ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہر زمانے میں ہر تہذیب میں اور ہر مذہب میں کسی نہ کسی مسیحا کی، کسی نہ کسی آنے والے کی، کسی نہ کسی ایسی ہستی کی نشان دہی ضرور کی گئی ہے جو ظلم اور جبر فضا کو ختم کر کے معاشرے کو عدل و خیر سے بھر دے گا۔ میں یہاں عرض کرتا چلوں کہ عہدِ حاضر میں نمود کرنے والے نظریات میں بھی ''آنے والا کل'' ''بہت حسین و خوش گوار ہوگا'' کی بہت تکرار کی گئی ہے بشرطیکہ ہم ان کے نظریات کو نافذ و رائج کر دیں۔ تمام آدرش وادی نظریے انسان کو مایوسی سے محفوظ کرنے اور اچھے مستقبل کی تعمیر میں لگ جانے کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ادیان عالم میں یہ صورت عقیدہ کی شکل اختیار کر جاتی ہے جب کہ جدید نظریات میں اس کے لئے دلیل و منطق کا ایک ڈھانچہ اس طرح استوار کیا جاتا ہے کہ مستقبل پر یقین ایک طے شدہ امر کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے قیام کے ساتھ ہی یہ بات رواج پا گئی تھی کہ اگر ہم نے سوشلسٹ نظام حیات کو اپنا لیا تو ہر ظلم اور زیادتی کا استحصالی نظام ختم ہو کر رہے گا اور جس طرح ان کے بقول اس وقت کے مشرقی یورپ کے سوشلسٹ ملکوں میں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی تھیں مشرق کا مستقبل بھی تابناک ہوگا۔ ''ایشیا سرخ ہے'' کا نعرہ لگانے والوں میں ہم جیسے پسماندہ طبقے کے نوجوان بھی شامل تھے اور مارکسی دانشور بھی یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ۔

سنا ہے دو قدم آگے مہک رہے ہیں چمن
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

ترقی پسند شاعری اس اُمید افزا اور خواب آور نظریہ کی ہر سطح پر ترجمانی کرتی نظر آتی تھی۔ جیسے کہ کہا گیا ہے۔

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجاز
ہم پر ہے ختم شام غریبانِ لکھنؤ

مجاز

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مخدوم

زندگی ہے تو بہرحال بسر بھی ہو گی
رات آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہو گی

جذبی

شب ظلم نرغۂ دشمناں سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

مجروح سلطان پوری

جب امبر جھوم کے ناچے گا
جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

ساحرلدھیانوی

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

ظہیر کاشمیری

مگر فیض کی شاعری میں یہ موضوع جتنی خوبصورتی اور جمالیاتی کمال کے ساتھ سامنے آیا اور تسلسل سے نظم ہوا ہے اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ امید اور بشارت، تبدیلی کی آرزو، خوش آئند مستقبل کا مضمون فیض کی غزلوں میں بھی اور نظموں میں بھی تواتر کے ساتھ نظم ہوا ہے۔

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

☆

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو گا اندھیروں کی فصیلوں سے اُدھر
ان کے شعلوں کے رجز اپنا پتہ تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے

☆

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے

☆

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

مگر وہ نظم جو اس سلسلے کی سب سے مقبول نظم ہے اور شاید اب پاکستان کے قومی ترانے کے بعد سب سے مقبول نظم بن کر سامنے آئی ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''ویبقیٰ وجہہ ربک'' یہ نظم انقلابِ ایران کے بعد لکھی گئی اور یہیں لندن میں لکھی گئی۔ فیض کا خیال تھا ''یہ ایرانی انقلاب اپنی قسم کا بڑا انقلاب'' تھا۔ انقلابِ فرانس کے بعد ایسا انقلاب دنیا میں نہیں آیا۔ روس، چین اور ویت نام کے انقلابوں میں طرفین کی فوجوں کے درمیان جنگ ہی ایران کے انقلاب میں عوام کی فوج کی براہ راست حکومتی اداروں سے جنگ ہوئی، جہاں عوام نے فوج کو شکست فاش دی۔

ہم دیکھیں گے

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے

جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

جب ظلم و ستم کے کوہ گراں

روئی کی طرح اڑ جائیں گے

ہم محکوموں کے پاؤں تلے

جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی

اور اہل حکم کے سر اوپر

جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی

جب ارضِ خدا کے کعبے سے

سب بت اُٹھوائے جائیں گے

ہم اہل صفا، مردودِ حرم

مسند پہ بٹھائے جائیں گے

سب تاج اچھالے جائیں گے

سب تخت گرائے جائیں گے

بس نام رہے گا اللہ کا

جو غائب بھی ہے حاضر بھی

جو منظر بھی ہے ناظر بھی

گونجے گا انا الحق کا نعرہ

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور راج کرے گی خلق خدا

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

☆

اسی ہال میں پڑھے جانے والے مضمون میں کہ جس کی صدارت خود فیض فرما رہے تھے کہا گیا کہ فیض کی شاعری حرف حق کی تلاش کی داستان ہے۔حرف اظہار کی معراج ہے۔صورت،حرکت،رنگ اور خط اور مفہوم سب حرف کے دامن میں سمٹ آئے ہیں۔الطاف گوہر نے کہا انجیل مقدس میں کہا گیا:

In the begining was the word and the word was with god and the word was god.

تخلیق کا آغاز حرف سے ہوا،حرف،حرف حق تھا اور وہی حق تھا۔برہ دارنڑیک اپنشد میں کہا گیا ہر نام کی ابتدا حرف سے ہوئی اور حرف ہی سے ہر نام لیا گیا۔قرآن کریم میں ارشاد ہے اقرا باسم ربک Proclaim in the name of your god۔''بول''فیض کے ہاں اقرا کے ترجمے کے طور پر آیا ہے۔اس میں مشورہ بھی ہے اور ترغیب بھی اور حکم بھی۔اعلان کی شکل،مشتاق یوسفی نے 'بول' کا ذکر کرتے ہوئے نو آزاد ملکوں میں جبر و استبداد کے پنجے میں جکڑی ہوئی خلق خدا میں ولولہ تازہ اور حوصلہ نبرد کو تیز کرنے کے لیے ''بول'' کا سہارا لیا۔''بارہ مصرعوں کی نظم بول''صرف فیض ہی کا عہد نامہ نہیں بلکہ اسے اگر تیسری دنیا کا عہد نامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔یہ نظم آج سے کوئی ستر برس پہلے لکھی گئی تھی جب برٹش راج کا سورج نصف النہار پر تھا اور زبان کھولنے پر قدغنیں لگی ہوئی تھیں۔اس میں ان کے مبارزت کے لہجے کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔مدھم مگر مضبوط سروں کے ساتھ وہ رجز کی لے تیز کر دیتے ہیں۔ہر چوتھی لائن کے بعد Tempo بڑھتا چلا جاتا ہے۔یہاں تک رجز خواں کے نفس گرم کی آنچ محسوس ہونے لگتی ہے اور آخری بند کے لحن میں عہد عتیق کے خبر دار کرنے والوں کا جاہ و جلال گونج اُٹھتا ہے۔

بول

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

بول زباں اب تک تیری ہے

تیرا ستواں جسم ہے تیرا

بول کہ جاں اب تک تیری ہے

دیکھ کے آہن گر کی دُکاں میں

تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے

پھیلا ہر زنجیر کا دامن

بول! یہ تھوڑا وقت بہت ہے

جسم و زباں کی موت سے پہلے

بول! کہ سچ زندہ ہے اب تک

بول! جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

نظم میں ''آہن گر'' کا تذکرہ مجھے اساطیر ایران کے بے مثال کردار کاوہ آہن گر کی طرف لے جاتا ہے جس نے ضحاک کے ظلم و جور و جفا کے خلاف بغاوت کی اور اپنی دھونکنی کا پرچم بلند کیا اور عہد ستم کا خاتمہ کیا۔ ''درفش کاویانی'' کے استعارہ سے اہل علم مجھ سے بہتر واقف ہیں۔

فیض نے ایران کے طلبہ پر، فلسطین کی جدوجہد آزادی پر، روس اور چین کے عوامی انقلابوں پر، افریقہ کی آزادی پر اور عالمی سامراج کی ریشہ دوانیوں پر بھی لکھا اور برصغیر اور بالخصوص پاکستان کے ہر اہم واقعے پر اپنا شعری تاثر ضرور رقم کیا۔

فیض عالم انسانیت کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری دوامی آفاقی انسانی قدروں کی ترجمان تھی مگر ظاہر ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار مقامی ہوئے بغیر آفاقی نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی زمین سے اور اپنے لوگوں سے جڑے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان سے لے کر اپنی وفات تک ہماری تاریخ کے ہر اہم واقعے پر فیض نے اپنا شاعرانہ تبصرہ ضرور کیا ہے۔ آزادی کا مرحلہ ہو یا آزادی اظہار پر لگنے والی قدغنوں کی صورتِ حال، مارشل لاء عہد میں جبر و تشدد کی صعوبتیں ہوں یا قید و بند کے مرحلے، مشرقی پاکستان کا المیہ ہو یا خلق خدا پر ہونے والے مظالم کی داستان، جلاوطنی کی منزلیں ہوں یا اپنے آدرشی مملکتوں کے بتدریج زوال اور انہدام کے اندیشے، ان سب کا بیان فیض کی شاعری میں موجود ہے۔

فیض کی شاعری کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی لغت شعر کلاسیکی مشرقی شعری روایت کی ترجمانی کرتی ہے۔ تہذیبی بلکہ مذہبی روزمرہ محاورہ سے استفادہ اس نوعیت کا ہے کہ بعض اوقات پڑھنے والے کو مشکل میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فیض کا یہ اسلوب حالی اور اقبال کا تسلسل ہے یا ردعمل اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں مگر مروجہ لفظوں کو معنی کی نئی جہتوں سے آشنا کر کے فیض نے اپنی بات جس طرح عوام تک پہنچائی ہے یہ کچھ ان ہی کا حصّہ ہے۔ پچھلے چند برسوں میں تو فیض کی اس وضع کی شاعری اور بھی زیادہ راسخ و مقبول ہوتی نظر آتی ہے۔ سرسری مطالعے میں کچھ ترکیبیں، کچھ مصرعے منتخب کیے ہیں۔ آپ بھی دیکھیے:

چھن گیا کیف کوثر و تسنیم، بے نیاز دعا ہے رب کریم، متاع غیرت و ایمان کی ارزانی نہیں جاتی، متاع لوح و قلم، نشاط وصل، حلال و عذاب ہجر حرام، فراق ظلمت و نور، پرورش لوح و قلم، بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں، یقیں جو غم سے عظیم تر ہے، سحر جو شب سے کریم تر ہے، میرے مقدور میں ہے معجزہ کن فیکون، لامکانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ، شورش زنجیر بسم اللہ، پھر برق فروزاں ہے سروادی سینا، خورشیدِ محشر کی لو، جس روز قضا آئے گی، للہ الحمد بانجام دل، دل زدگان کلمہ شکر بنام لب شیریں دھناں، فرش پر آج درِ صدق و صفا بند ہوا، عرش پر آج ہر اک باب دعا بند ہوا۔ ہر اک اولی الامر کو صدا دو کہ اپنی فرد عمل سنبھالے۔

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شور محشر یہیں حساب و کتاب ہوگا
ہم جیتیں گے لازم ہے کہ ہم بھی جیتیں گے

فیض جس آدرش پر یقین محکم رکھتے تھے اس کا تقاضا تھا ''تمام فنون کا مقصد انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں ایک ایسے فن کی تخلیق ہے جو سب کے لیے انتہائی قابل فہم ہو یعنی ایک انسان دوست معاشرہ اور انسان کے لیے اس کا شاہکار--- (کارل مارکس)۔اس اصول کی روشنی میں فیض کی شاعری کے چلن کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس سطح پر عوام وخواص سے محو کلام تھے۔انھوں نے مکالمے کی ایک ایسی غنائی جمالیاتی روایت کا آغاز کیا جس کے وہ خود ہی بنیاد گزار بھی تھے اور خود ہی اس کو منزل کمال تک پہنچانے والے بھی۔پچھلے چند برسوں میں سیاسی جلسوں سے لے کر مذہبی اجتماعات تک تحریکوں کے درمیان درس گاہوں میں نوجوان نسل کے اندر کسی اور شاعر نے اس درجہ رسوخ حاصل نہیں کیا جتنا فیض کی نظموں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔بعض نظمیں محنت کشوں سے لے کر عدل کے ایوانوں اور پارلیمان سے لے کر شاہراہوں میں برابر گونج رہی ہیں۔سب منتظر ہیں وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے، جو لوح ازل پہ لکھا ہے، ہم جیتیں گے، لازم ہے کہ ہم بھی جیتیں گے، جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی، یہیں پہ روز حساب ہوگا۔چاند کو گل کریں تو ہم جانیں، جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے، جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے، چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی ——— اور کون سا شاعر ہے جس کی نظمیں لکھے جانے کے بعد اس طرح عوام نے حرز جاں بنا رکھی ہیں جیسے فیض کے مصرعے ہیں۔

اب ایک بات مضمون سے ہٹ کر۔

فیض کی شاعری کا سفر کتنی دور تک جاری رہے گا؟ اس سوال کے جواب کا انحصار اس بات پر ہے کہ خود زبان اردو کا مستقبل کیا ہوگا۔جب تک اردو زندہ ہے فیض کی شاعری زندہ رہے گی۔میرے منھ میں خاک اگر اردو ختم ہوگئی تو نہ فیض رہیں گے، نہ راشد، نہ میراجی، نہ جوش وفراق، نہ اقبال، نہ غالب۔زبانوں کے نام پر سیاست ایک بھیانک کھیل پہلے بھی کھیل چکی ہے۔اہل سیاست لسانی تعصبات پر دوکانیں چمکانا ترک نہیں کریں گے۔نئے کھیل کا انجام بھی بھیانک ہو سکتا ہے۔پاکستان کی تمام زبانوں کو ان کا حق رعایت کی طرح نہیں حق کی طرح ملنا چاہیے۔میرا ایمان ہے کہ اردو کا مستقبل سب زبانوں کے ساتھ پہلے بھی تھا اور آج بھی رہے گا۔فیض زندہ صحبت باقی۔

کیا زمانہ تھا جب سویت یونین اپنے تمام کروفر کے ساتھ عالمی بساط سیاست پر نمایاں تھا اور وہ تمام اہلِ قلم جو مجبور اور مظلوم طبقوں کی حمایت کرتے تھے انقلاب کی سرزمین سے اپنا رشتہ جوڑتے نہیں تھکتے تھے۔ سب نے کسی نہ کسی طور پر سویت انقلاب کی حمایت ضرور کی۔ فیض بھی آخر دم تک سویت یونین کے حلیف رہے اور اس وقت بھی جب Prestroika کے زمانے میں Glasnost کے ماحول میں بلکہ اس سے پہلے بقول ڈاکٹر لدمیلا وسیلیفو، فیض کو سویت قیادت سے کچھ شکایتیں پیدا ہوئیں مگر فیض نے شائستہ خاموشی کا رویہ اپنایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ روسی قیادت کے بجائے روسی اہل قلم اور سویت عوام سے اپنا رشتہ جوڑتے رہے جب کہ ان کے ساتھی سویت روس کی حمایت میں اتنے دور نکل گئے تھے جن کا کوئی متوازن شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ابھی کل کی بات ہے ہماری جوانی کا زمانہ ان شاعروں کی محبت میں گزارا گیا جو کہہ رہے تھے:

لینن کے پیغام کی جے ہو اسٹالن کے نام کی جے ہو
جے ہو اس دھرتی کی جس پر اپنا اجارہ ہو کے رہے گا
(مجروح سلطانپوری)

☆

سٹیلن میرا باپ (عارف عبدالمتین)
مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

اور تو اور یہاں انگریزی کے ایک ممتاز شاعر فرما رہے تھے۔

No father to his children did what Lenin did for us.

فیض کی نرمی اور مٹھاس اپنے آدرش کی حمایت کرتے ہوئے بھی برقرار رہی۔ بلاشبہ فیض کو ماسکو عزیز تھا کہ وہاں کے لوگوں سے اُنہوں نے محبتیں کی تھیں اور اس شہر سے اُنہوں نے دو چیزیں سیکھی تھیں۔

''ایک امن سے محبت کرنا اور جنگ کرنا لیکن جنگ کے لئے نہیں بلکہ امن کے لئے جنگ کرنا۔ ماسکو میں اُنہوں نے اپنی زندگی کے بہت مشکل اور بہت خوشگوار دن گزارے اور اردو کی لازوال اور بے مثال نظمیں لکھیں۔ پاس رہو ۱۹۶۳ء کے اوائل میں لکھی تھی۔

تم مرے پاس رہو

مرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو

جس گھڑی رات چلے

آسمانوں کا لہو پی کر سیہ رات چلے

مرہم مشک لیے، نشترِ الماس لیے

بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے

درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے

جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل

آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی راہ تکنے لگیں

آس لیے

اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقلِ مے

بہر ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے

جب کوئی بات بنائے نہ بنے

جب نہ کوئی بات چلے

جس گھڑی رات چلے

جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے

پاس رہو

مرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو

☆☆☆

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام

بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ

جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ

حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل

نیل کی جھیل

جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب

ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ

بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب

میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ

شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب

جس طرح دور کسی خواب کا نقش

آپ ہی آپ بنا اور مٹا، آہستہ

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ

تم نے کہا ''آہستہ''

چاند نے جھک کر کہا

''اور ذرا آہستہ''

☆☆☆

فیض کا ایمان تھا امن سے صرف محبت نہیں کی جانی چاہئے اس کے لئے جدوجہد بھی کی جانی چاہئے۔ امن کے لئے مستقل اور غیر مصالحانہ جدوجہد کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ یہ جدوجہد ہر ایمان دار کا فریضہ ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔ اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی۔ جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

دنیا میں ہمارا خطہ اور مشرقِ وسطیٰ کے مختلف شہر جس صورتِ حال سے گزر رہے ہیں اس میں فیض کی شاعری جیسی زندہ اور بامعنی نظر آ رہی ہے کوئی اور شاعر اس کے قریب سے بھی نہیں گزرتا۔

☆

ترقی پسند ادب اور پروپیگنڈے پر بعض بزرگوں کی طرف سے سخت حملے ہوئے فیض نے واشگاف لفظوں میں اعلان کیا اچھا ادب بھی ایک سطح پر موثر پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتا ہے۔ افکار اسلامی کی ترجمانی میں بڑی بڑی تبلیغی اور دعوتی نوعیت کی کتابوں کے انبار نے وہ کام نہیں کیا ہوگا جو کارنامہ اقبال کی شاعری نے سرانجام دیا۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں جلال الدین رومی کی اثر انگیزی نے تصوف کو کن کن انجان سرحدوں تک پہنچایا، صاحبانِ علم اسے مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ گیتا تلسی داس کی رامائن، سورداس کی پداولی اور میرابائی کے بھجن بھی اس تناظر میں رکھے اور دیکھے جا سکتے ہیں۔

اپنے قارئین کے لئے کہ ادب ایک سطح پر لطیف تفریح، جمالیاتی انبساط و فرحت انگیز سرشاری Aesthetic pleasure, entertainment, enjoyment and dilight بھی فراہم کرتا ہے مگر صرف یہی اس کے مقاصد نہیں ہیں۔ تیسری دنیا میں نوآبادیاتی سامراجی صورت حال کے دوران اور اس کے بعد بھی لکھنے والا صرف شاعر یا ادیب نہیں ہوتا وہ ایک راہبر و رہنما بھی ہوتا ہے۔ مصلح بھی ہوتا ہے، استاد بھی ہوتا ہے فکر کی تعمیر و تشکیل بھی کرتا ہے اور رائے عامہ کو تبدیل بھی کرتا ہے۔ فیض مسدس حالی اور حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی جانے والی نظموں اور حسرت موہانی کی عملی جدوجہد کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتوں کے بعد آئے تھے۔ انیسویں صدی کی ۳۰ویں دہائی برصغیر کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی کہ اس میں ادب طبقہ اشرافیہ سے نکل کر عوام الناس میں روشناس ہوا۔ سرسیّد، ڈپٹی نذیر احمد، پریم چند، اقبال، انگارے اور ترقی پسند تحریک نے ادب کو مزدوروں، کسانوں، کلرکوں، خواتین، اساتذہ اور دیگر عوامی طبقوں میں مقبول کیا۔ بعد کے زمانوں میں جوش، مخدوم، مجاز، فیض، شیخ ایاز، جالب، فراز، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض اتنے مقبول اور محبوب ہوئے کہ Glamour world کے Celebraties کی شہرت بھی ان کے سامنے ماند پڑتی نظر آتی تھی۔

☆

ایڈورڈ سعید نے Yeats اور نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارے کے حوالے سے بہت سی نئی باتوں کا انکشاف کیا ہے کہ کس طرح حُبّ الوطنی کے نام پر نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر پروان چڑھنے والی سیاست تیسری دنیا میں گل کھلاتی رہی ہے۔ Frantz Fanon کے مصنف The wretched of the Earth کو نقل کرتے ہوئے Edward Saeed نے لکھا ہے کہ کس طرح بورژوا طبقے کے سیاستدان نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بھی سامراجی رویوں اور ہتھکنڈوں کو استعمال کرتے ہوئے نوآزاد معاشروں میں استحصالی نظام کو قائم کرنے اور اسی روایت کو مسلسل رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ ختم ہوئی تو اس کے بعد استحصالی طبقے کی ریشہ دوانیاں کھل کر سامنے آگئیں۔ عوام نے اور خاص طور پر پسماندہ اور متوسط طبقے کے گروہوں نے آزادی سے جو خواب جوڑ رکھے تھے وہ دیکھتے دیکھتے بکھر گئے تھے۔ استحصال کی یہ شکل پہلے سے بھی زیادہ کریہہ اور بھیانک تھی۔ ۱۹۴۷ء کے سال کا دوسرا نصف پے در پے فسادات کے جلو میں آزادی کی نوید لایا۔ وہ اہل قلم جنہوں نے مجبوروں اور مظلوم طبقوں کے لئے ایک بہتر معاشرے کا خواب دیکھا تھا وہ خاموش نہ رہ سکے اور فیض نے وہ معرکتہ لآرا نظم لکھی جو آج بھی اتنی ہی Relevant اور بامعنی معلوم ہوتی ہے جیسے پہلے تھی۔ فیض نے جس تناظر میں نظم لکھی وہ لہجے کی بے باکی، جذبے کی شدت اور جمالیاتی حسن کے سبب آج بھی ان کی نمائندہ نظم سمجھی جاتی ہے۔ عنوان بھی واشگاف گفتگو بھی براہِ راست۔

صبحِ آزادی

اگست ۱۹۴۷ء

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مِل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غم دل
جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے

چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے سرو خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال اور عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ نظر کی اُمنگ دل کی جلن
کسی پر چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

☆

ایلیٹ نے بہت درست بات کی تھی کہ کوئی بھی شاعر یا کوئی بھی فنکار اس وقت تک ہماری گرفت میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہمارے سامنے اس کے پیش روؤں کا مکمل تناظر نہ ہو۔ جب بھی کوئی نیا فن پارہ وجود میں آتا ہے اس میں صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے نہیں اپنے پیش رو منظر نامے کی معنویت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ دیانت دارانہ تنقید اور بامعنی اور موثر تحسین کا مرکز و محور شاعر کی ذات نہیں بلکہ شاعری ہوتی ہے۔ یہ وہی بات ہے جو ایذرا پونڈ نے ایچ ڈی کے ایک خط میں متیس (Matisse) کا حوالہ دیتے ہوئے کہی تھی۔

We should discuss the piece of Art and not the Artist.

فیض پر لکھی جانے والی تحریروں میں اکثر تحریریں وہ ہیں جن میں شاعر کی ذات یا شخصیت زیرِ بحث آتی ہے۔ ان کی شاعری کے اصل متن پر کم بات ہوتی ہے۔ میں نام گنوانا نہیں چاہتا گنتی کے چند مضامین چھوڑ کر فیضیات کا بڑا حصہ ایسے ہی مضامین اور تحریروں پر مشتمل ہے جن کا تعلق اکثر ایسے Anicdotes سے ہے جو ملاقاتوں، قصوں، واقعات اور خاص طور پر ایک محبوب شخصیت کی کرشماتی زندگی سے کشید کیے جاتے ہیں۔ ایک اور بات اسی سلسلے کی ہے۔ کوئی شاعر مکمل طور پر SelfSufficient نہیں ہوتا۔ اس کا پیش رَو منظر نامہ اور عصری تخلیقی سرگرمیاں دونوں شعوری یا غیر شعوری طور پر اثر انداز ہو کر رہتی ہیں۔ اقبال، حالی، حسرت اور اختر شیرانی کس کس طور پر فیض پر اثر انداز ہوئے اور کس کس طرح مخدوم، جوش، مجاز اور دیگر ترقی پسند شعرا کے فکری اشتراک نے فیض کی شاعری کو متاثر کیا۔ اس کے بارے میں بہت معتبر لکھنے والے اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ میں اس تکرار سے بچتے ہوئے بس ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خود فیض کی تحریروں ہی سے اپنی روایت اور ہم عصر دونوں سرچشموں سے انحراف و اعتراف کی مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں۔

☆

فیض احمد فیض (۱۹۸۴ء۔۱۹۱۱ء) ہماری ایک عظیم قومی شخصیت ہیں اور ہمارے لئے نہایت فخر کا مقام ہے کہ ان کی تہذیبی، خصوصاً تخلیقی خدمات کا اعتراف ہماری قومی سطح کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی عالمی سطح پر بھی کیا گیا اور اعترافِ عظمت کا یہ سلسلہ مستقل طور پر توسیع پذیر ہے۔

فیض کی تہذیبی خدمات متنوع عملی اور ذہنی شعبوں میں ہیں، جن میں سے سب سے بڑا شعبہ ان کے تحریری کاموں کا ہے، جو نثر میں بھی ہیں اور شاعری میں بھی۔ ان ساری متنوع تہذیبی خدمات میں مرکزی اہمیت ان کی شاعری کو حاصل ہے۔ اسی مرکزی اہمیت کے پیشِ نظر موجودہ انتخاب کا غالب حصہ ان کی شاعری ہی کے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔

فیض ایک بڑے سماجی آئیڈیل سے والہانہ وابستگی رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری نے متعدد نسلوں کے شاعروں اور قارئین کو متاثر کرتے ہوئے ان کو تخلیقی تحرک بھی عطا کیا اور ان کی فنی و جمالیاتی تعلیم و تربیت بھی کی اور اس دوگونہ تاثیر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ہر بڑا ادیب ادبی تنقید اور ادبی نظریے کو مستقل طور پر نئی سے نئی آزمائش میں ڈالے رکھتا ہے اور یہی خوبی فیض کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ ہر نئی نسل کے اہم ادبی نقادوں اور ادبی نظریہ سازوں نے ان کی شاعری کو ضرور اپنا موضوع بنایا ہے اور یقینی طور پر آئندہ نسلوں کے ادبی نقاد اور ادبی نظریہ ساز بھی اس عمل سے بیگانہ نہیں رہیں گے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ کسی مظہر کی کوئی سائنسی صداقت ایک بار ہی دریافت ہوتی ہے اس کی جمالیاتی قدر بار بار دریافت ہوتی ہے، فیض کی شاعری جو خود ایک اعلیٰ فنی و جمالیاتی مظہر ہے، اس پر یہ بات اور بھی زیادہ صادق آتی ہے۔

(فیض احمد فیض، فیض صدی: منتخب مضامین کے دیباچہ سے اقتباس جسے یوسف حسن اور ڈاکٹر روش ندیم نے لکھا۔)

☆